FJG N41
3

سلسلۂ اشاعت امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ ۳

شجاعت کے مثالی کارنامے

(دوسرا ایڈیشن)

HABIB ELECTRIC TRADING CO.

از افادات

سرکار سید العلماء، علامہ علی نقی النقوی
مجتہد العصر مدظلہ

قیمت ۶ر آنے

maablib.org

امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ، اُردو بازار لاہور

کی یہ تیسری پیشکش ہے

اس سے "قبل خدا کا ثبوت" اور "حسینؑ اور اسلام" شائع ہو چکے ہیں انسان کے شریف خصائل میں شجاعت کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ میدانِ کربلا کی تپتی جلتی ریت پر حضرت امام حسین علیہ السلام اور ان کے بے مثل و بے نظیر اصحاب نے انسانی کردار کی بلندی کے وہ وہ جوہر دکھائے ہیں کہ انسانوں کی پوری تاریخ انگشت بدنداں ہے۔ اگر ان کی مظلومیت ضرب المثل ہے تو ان کی شجاعت بھی اپنی مثال آپ ہے۔

حسینؑ کیسے تھے؟ ان کو لوگ کسی حد تک جانتے ہیں، مگر حسینؑ کے ساتھی کیسے تھے یہ کم لوگوں کو معلوم ہے زیرِ نظر رسالہ میں کربلا والوں کی شجاعت کا مقام رفیع دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

سرکار سید العلماء علامہ علی نقی النقوی مجتہد العصر لکھنؤ کی سہ روزہ تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹس سے یہ رسالہ مرتب کیا گیا ہے۔ جسے امامیہ مشن لکھنؤ نے محرم ۱۳۷۴ھ میں شائع کیا تھا۔ اور امامیہ مشن پاکستان نے محرم ۱۳۷۵ھ میں اس کو پہلی مرتبہ شائع کرنے کی سعادت حاصل کی۔ مقام شکر ہے کہ ایسے مفید اور محققانہ رسالہ کی غیر معمولی افادیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے افراد ملت نے اسکو ہاتھوں ہاتھ لیا اور اب اس کا دوسرا ایڈیشن اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔

خادمِ دین سید حسن علی شاہ کاظمی سیکرٹری امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ لاہور

maablib.org

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَاٰلِہِ الطَّاھِرِیْنَ

قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ وَکَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قَاتَلَ مَعَہٗ رِبِّیُّوْنَ کَثِیْرٌ فَمَا وَھَنُوْا لِمَا اَصَابَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَکَانُوْا وَاللّٰہُ یُحِبُّ الصّٰبِرِیْنَ۔

ارشادِ قرآنی ہے کہ:۔

"بہت سے انبیاء ایسے تھے جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی تو نہ ان میں سستی پیدا ہوئی ان مصائب سے جو راہِ خدا میں در پیش ہوئے اور نہ ان میں کمزوری آئی اور نہ انہوں نے مسکینی اور عاجزی کا کوئی طرز اختیار کیا۔ اور اللہ تو صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے"

اس آیت میں جو مجمل تذکرہ ہو رہا ہے اسے صرف کسی تاریخی واقعہ کا بیان سمجھا نہیں جا سکتا۔ بلکہ اس میں صاف دنیا کو ایک معیارِ شجاعت سے روشناس کرنے کا مقصد مضمر معلوم ہوتا ہے جسے اس نے ایک واقعۂ ماضی کے تذکرہ کی تہ میں پیش کر دیا ہے

مفہومِ شجاعت ۔ عام طور سے شجاعت کا جو مفہوم لوگوں

کے ذہن میں ہے، وہ یہ ہے کہ ہر موقع پر نڈر رہنا، ہر خطرہ سے بے پروائی کے ساتھ دوچار ہو جانا۔ بے دھڑک لڑ پڑنا اور ہولناک حالات کے اندر بلا خطر کود پڑنا۔

اس مفہوم کے لحاظ سے جو اشخاص بے دھڑک اقدامات کر لیں انہی کو بہادر تصور کیا جاتا ہے۔ بہرحال یہ "بہادر" آپ کی زبان کا لفظ ہے۔ اور آپ کو اختیار ہے کہ اس کے جو معنی آپ چاہیں قرار دے لیں۔ لیکن "شجاعت" جو علم الاخلاق کا اصطلاحی لفظ ہے اور جسے ایک ممدوح صفت خیال کیا جاتا ہے وہ بے سمجھے بوجھے اقدامات پر ہرگز صادق نہیں آتی۔ ایسے شخص کے لئے آپ خواہ پُرجگر، نڈر یا اور اسی طرح کے الفاظ اپنے نکتۂ نظر کے ماتحت تعریف کرنے کے لئے تلاش کیجئے۔ لیکن شجاع نہیں کہہ سکتے۔ علم الاخلاق کی اصطلاح میں حد سے بڑھی ہوئی اور بے موقع بہادری کو "تہور" کہتے ہیں۔ جس طرح بے موقع قدم پیچھے ہٹنے کو "جُبن" یعنی بزدلی۔ اور یہ دونوں صفتیں مذموم ہیں۔

ممدوح جو صفت ہے وہ ان کا درمیانی راستہ ہے جسے شجاعت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور اس کی تعریف یہ ہے، کہ صحیح مقصد کی خاطر صحیح طریقہ کار کے ساتھ برمحل فرائض کی انجام دہی سے نہ جھجکنا۔

اب مذکورہ بالا آیت قرآن میں دیکھئے کہ شجاعت کے معیار میں کتنے خصوصیات پیش کئے گئے ہیں۔ پہلے مقصد کی تعیین۔ اسے فی سبیل اللہ کے لفظ سے ضروری قرار دیا۔ حقیقت میں جسے علم الاخلاق کی اصطلاح میں صحیح مقصد کہا جائے گا۔ اسی کو مذہب کی اصطلاح میں فی سبیل سے تعبیر کرتے ہیں۔ فی سبیل اللہ کے معنی "اللہ کی راہ میں" ظاہر ہے کہ اللہ کے راستہ سے مراد کوئی مادی راستہ نہیں ہے۔ جو شمال، جنوب، مشرق یا مغرب جاتا ہو یا کوئی ایسی سڑک نہیں ہے جس کو جسمانی پیروں سے طے کریں، یاد رکھئے کہ جیسی منزل ہو گی ویسا ہی اس کا راستہ ہو گا اگر منزل مادی ہے تو راستہ بھی مادی ہو گا۔ اور مادی پیروں سے ہم اسے طے کر سکیں گے۔ لیکن جب منزل ہے وہ، جو مادیت سے بری ہے جو لامکان ہے اور لامحدود، تو اس تک پہنچانے والا راستہ بھی مادی نہیں ہو سکتا۔ اس میں بھی کسی سمت اور کسی رُخ کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ اس راستہ کے معنی ہیں وہ شاہراہ عمل، وہ طریق کار جو منشاء الٰہی کے مطابق اس کے مقاصد سے سازگار اور اس کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہو اور کھلی ہوئی بات ہے کہ خداوند عالم کی رضا کسی غلط کام کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ معلوم ہوا کہ فی سبیل اللہ کے مفہوم میں "صحیح مقصد" صاف طور سے موجود ہے۔

maablib.org

اب اس مقصد کی خاطر جو مصائب سامنے آئیں شرط یہ ہے کہ قدم
آگے بڑھانے والوں میں ان مصائب کی وجہ سے کمزوری نہ پیدا ہو۔ کمزوری نہ
ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ فریقِ مخالف کے مقابلہ میں شہ زور اور
مادی اسباب کے لحاظ سے قوی زیادہ ہوں۔ ایسا نہیں ہے بلکہ الفاظ آیت
بتا رہے ہیں کہ مادی طاقت کے اعتبار سے تو وہ اپنے مخالف کے مقا
میں کمزور ہیں۔ اس لئے کہ اگر وہ طاقت میں اس سے کم نہ ہوتے تو اس
مدح و توصیف کے کوئی معنی نہیں ہوتے۔ کہ انہوں نے عاجزی نہیں دکھا
نیز یہ کہنا کہ راہِ خدا میں جو مصیبتیں ان کو درپیش ہوئیں وہ ان کے سستی
کا باعث نہیں بنیں۔ اس سے بھی بمقابلہ دشمن ان کی کمی اور کمزوری کا پتہ چ
ہے۔ ورنہ انہیں مصیبتیں کیا درپیش ہوتیں وہ خود اپنے دشمن کو نقصا
اور تباہی سے دوچار کرتے۔ بلاشبہ یہ مصیبتیں پہنچنے کا ذکر اور عاجز
نہ اختیار کرنے کی توصیف صاف مادی اعتبار سے ان کے ضعف
پتہ دیتی ہے۔ تو پھر اس ارشاد سے کہ ان میں کمزوری نہیں پیدا ہوئی ما
طاقت کی کمزوری سمجھنا غلط ہوگا۔ بلکہ اس سے قوتِ ارادی کی کمزوری طا
دل کی کمزوری اور عزم کی کمزوری مراد ہے۔ یعنی اگرچہ وہ مادی حیثیت سے
ہیں۔ سامانِ جدال و قتال کی کمی ہے، اسبابِ حرب فراہم نہیں ہیں
ان کی قوتِ ارادی میں کوئی کمزوری نہیں۔ اور دل کی قوت
کوئی کمی نہیں۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ عمل میں سستی کا اظہار نہ
ہوتا۔ تیسری صفت یہ ہے کہ مسکینی اور عاجزی نہیں کر

یعنی مصائب سے گھبرا کر باطل کے سامنے سپر اطاعت خم کرنے کا رجحان کبھی نہیں پیدا ہوتا - اور آخری صفت صبر یعنی شدائد کو برداشت کرتے ہوئے راہِ حق سے قدم نہ ہٹنا یہ معیار شجاعت کا ہے - جو قرآن پیش کر رہا ہے۔

یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس نبی یا ولی کی تعریف نہیں کی جاتی - جس کی معیت میں اس جماعت نے جہاد کیا ہے - بلکہ محل مدح میں جناب باری اُن کا تذکرہ کرتا ہے جو اس نبی کے ساتھی ہیں - حالانکہ خود وہ نبی یا ولی بدرجہ اتم ان خصوصیات کا حامل ہوگا - مگر اس کا ذکر غیر ضروری سمجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے - خود اس کا ثابت قدم رہنا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے مگر ساتھیوں کا اس معیار پر پورا اترنا ایک غیر معمولی امر ہے جس کا تذکرہ بلاغتِ قرآنی کو ضروری معلوم ہوا ہے۔

ہمہ گیر معیارِ عزت

اس امر کو بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ ان تمام سختیوں کا جھیلنا اور ثابت قدم رہنا اور خطروں میں پڑنا مستحسن اسی لحاظ سے ہوتا ہے کہ وہ صحیح مقصد سے ہے۔ یعنی فی سبیل اللہ ہے - اس لئے کہ اللہ ہمیشہ ان ہی چیزوں کو پسند کرتا ہے جو اخلاق انسانی کے لحاظ سے نظام عالم کے لئے مفید اور باعثِ خیر و صلاح ہیں اسی ذیل میں قرآن کی ایک آیت ہے جس میں تمام اچھائیوں اور برائیوں کا جامع الفاظ میں ذکر کر دیا گیا ہے - ارشاد ہوتا ہے

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاۗئِ ذِی الْقُرْبٰی

وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (یعنی) اللہ، عدالت، احسان اور قرابتداروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتا ہے اور بے راہ روی، بدکاری اور زیادتی سے منع کرتا ہے اور اسی لئے ہدایتیں آتی ہیں کہ تم ان فرائض وحدود کو عملی زندگی میں پیش نظر رکھو۔

اس سے ثابت ہوگیا کہ کوئی برائی اللہ کے نزدیک ممدوح نہیں ہے اور نہ کوئی اچھائی مذموم۔ دنیا کے تمام مذاہب اسی بات پر متفق ہیں مذہب کا لازمی جزو ہے۔ تصور الٰہ کا ہونا اور ہر مذہب کا اصول یہ ہے کہ اللہ برائی کو ناپسند کرتا ہے اور بھلائی اس کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مختلف انسانوں میں اچھائی اور برائی کی تشخیص میں بعض وقت اختلاف ہوتا ہے۔ ایک کے نزدیک جو اچھی بات ہوتی ہے وہ دوسرے کے نزدیک کبھی بُری ہوا کرتی ہے۔ اس لئے اہلِ مذاہب میں مذہبی نقطۂ نظر سے بھی بعض باتوں کے جائز و ناجائز ہونے میں اختلاف ہوا کرتا ہے۔ لیکن اصل اصول متفق علیہ ہے اور اس لئے جو خوبیاں تمام مذاہب کے نزدیک متفق علیہ ہیں ان کا اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہونا اور جو برائیاں سب کے نزدیک متفق علیہ ہیں ان کا اللہ کو ناپسند ہونا بھی مسلّم ہے۔ اب اگر انہی برائیوں سے تحفظ کی خاطر کسی نے جہاد کیا ہو یا جان قربان کردی ہو تو اس مجاہد اور شہید کی عزت ایک فرقہ میں محدود نہ رہے گی۔ بلکہ اس کی حیثیت ہمہ گیر ہوگی۔ ہمہ گیر تو اس وقت نہ ہوتی کہ جب ان اصولوں کو جنہیں

بچانے کے لیئے اس نے جہاد کیا اور قربانی پیش کی ہے۔ اختلافی حیثیت حاصل ہوتی یعنی کوئی انہیں ممدوح سمجھتا اور کوئی مذموم خیال کرتا تو اب چاہیے اس طرف سے کہیئے کہ جو متفق علیہ طور پر اچھے مقاصد کی خاطر جان دیدے گا وہ ہمہ گیر حیثیت کا مالک ہوگا یا نتیجہ کو مشاہدہ سے دیکھ کر یہ حکم لگایئے کہ تمام مذاہب کے لوگ جس شہید کو متفقہ حیثیت سے مانتے ہیں اس نے ضرور ایسے ہی مقاصد کے لئے جان دی ہے جو سب کو عزیز ہیں۔

امم سابقہ میں جہاد کے قرآنی تذکرے اور ہمراہیان انبیاء کے ثبات یا تزلزل قدم کے نقشے

گذشتہ آیت وَكَاَيِّنْ مِنْ نَبِيٍّ میں تو صرف اجمالی تذکرہ کیا گیا ہے کہ انبیاء کے ساتھ ایسے لوگوں نے اکثر راہ خدا میں جنگ کی اور یوں ثبات دکھایا مگر اس کی تفصیلی کیفیت نہیں معلوم ہوتی کہ جنگ میں جتنے نبی کے ساتھ آتے تھے وہ سب ان صفتوں سے متصف ہوتے تھے یا ان میں سے بعض اور وہ بعض بھی اس جماعت میں کی اکثریت ہوتی تھی یا اقلیت۔ آیئے اس کی تفصیل اسی قرآن میں ان دوسرے مقامات پر تلاش کریں جہاں خاص خاص لڑائیوں کے خصوصی حالات کا ذکر کیا گیا ہے۔

ان میں سے ایک موقع طالوت و جالوت کی جنگ کا ہے۔ جس کا آغاز سے انجام تک تذکرہ قرآن میں موجود ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی اِذْ قَالُوْا لِنَبِیٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ آیت ۲۴۶

دیکھنے کے قابل تھا وہ موقع جب موسیٰؑ کے بعد بنی اسرائیل میں کی ایک جماعت نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک حاکم مقرر کر دیجئے کہ ہم (اس کی سرکردگی میں) راہِ خدا میں جنگ کریں"

قَالَ هَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا - نبی نے جواب دیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب تم پر جنگ کا فریضہ عائد کر دیا جائے، تو پھر تم جنگ نہ کرو۔

یہ ان کے عزم و ارادہ کی حقیقت کے متعلق نبی کی نگاہ بصیرت کا فیصلہ تھا جس کی اظہار اندیشہ کے طور پر پردہ کشائی ہو رہی تھی۔ اور جس کے ذریعہ سے اتمام حجت کی منزل کو طے کیا جا رہا تھا۔

قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا۔ انہوں نے جواب دیا بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہم راہِ خدا میں جنگ نہ کریں جبکہ ہم اپنے گھر بار کو چھوڑ کر اسی لئے نکالے گئے ہوں گے۔ مگر نتیجہ میں کیا ہوا؟

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَیْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْهُمْ اس کے بعد جب ان پر فریضہ جنگ عائد کیا گیا تو سوائے تھوڑے سے آدمیوں کے سب نے دشمن کے سامنے سے روگردانی اختیار کی"۔

ابھی اس کی مزید تفصیل سنئے کہ انہوں نے شروع سے آخر تک کس طرح

قدم قدم پر مخالفت کی وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا قَالُوا أَنّٰى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِنَ الْمَالِ - ان کی خواہش کو پورا کرتے ہوئے ان کے لئے ایک حاکم کا تقرر خالق کی طرف سے منظور ہو گیا - اب ان کے نبی نے ان سے کہا کہ اللہ نے طالوت کو تمہارے لئے حاکم قرار دیا ہے -

انہوں نے کہا بھلا انہیں ہم پر حکومت کا کیا استحقاق ہے - ان سے زیادہ تو حکومت کی اہلیت ہم میں خود موجود ہے - ان کے پاس مال و دولت تو کچھ زیادہ موجود ہی نہیں ہے "

یہ تھی پہلی مخالفت - خیر نبی نے سمجھایا کہ نہیں انہیں اللہ نے منتخب کیا ہے اور انہیں علم اور جسمانی قوت میں زیادتی دی ہے اور حاکم مقرر کرنا صرف اس کا کام ہے ، وہ جسے چاہتا ہے یہ منصب دیتا ہے - پھر اس کی حقانیت اور سچائی کے لئے ایک علامت بھی بطور دلیل و حجت بتا دی کہ وہ تابوت موسیٰؑ جو مدتوں سے غائب ہے اور جس میں انبیائے بنی اسرائیل کے تبرکات ہیں وہ اسی موقع پر خالق کی طرف سے تمہارے پاس آ جائے گا - اور یہ معجزہ بھی اسی لئے تھا کہ جماعت کے دل میں استحکام پیدا ہو اور تزلزل و شک دور ہو - ارشاد ہوا إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَآيَةً لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ - اس تابوت کے آ جانے میں تمہارے لئے بہت

بڑی نشانی (معجزہ) ہے اگر تم ایمانداری سے دیکھو"

مگر اس ردّو قدح کے بعد نبی کی ان فہمائشوں کے بعد معجزہ کے آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ۔

"جب طالوت فوجوں کو لیے ہوئے روانہ ہوئے" "فوجوں" کے لفظ سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ مجموعی طور پر ساتھ والے کتنی بڑی تعداد میں تھے، مگر ہوا کیا کہ طالوت نے کہا "دیکھو خدا تمہارا امتحان لینے والا ہے ایک نہر سے"

یہ مخصوص آزمائش ہے کہ پانی کی نہر سامنے بہہ رہی ہو مگر لب تر نہ ہوں۔ تو جو شخص اس نہر سے پانی پی لے گا اسے مجھ سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور جو نہ پیئے گا وہ میرا قرار پائے گا۔ ہاں مگر یہ کہ کوئی شخص چلّو میں پانی لے کر پھینکدے، تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اب دیکھئے کہ اس امتحان میں کتنے ثابت قدم رہے۔

فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ حالانکہ پہلے سے صریحی حکم دے دیا گیا تھا اور متنبہ کر دیا گیا تھا۔ مگر جتنے تھے سب نے پانی پی لیا۔ سوائے بہت کم لوگوں کے ان میں سے"

یہ دوسری بہت بڑی مخالفت تھی جن میں استثناء بس ایک تھوڑی سی اقلیت کا رہا اور سب مبتلائے معصیت ہو گئے۔ اب آخر میں جنگ کا نتیجہ جس کا پہلے بھی اجمالی ذکر ہوا تھا۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُوا اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ

جب اس نہر سے آگے بڑھے طالوت اور ان کے ساتھ کے ایمان رکھنے والے تو وہ کہنے لگے کہ ہم اس جنگ میں جالوت اور اس کے افواج کے مقابلہ کی طاقت نہیں رکھتے ان چند لوگوں نے جنہیں خیال تھا کہ اللہ کے سامنے کبھی جانا ہے کہا کہ اکثر چھوٹی تعداد کی جماعتیں بڑی تعداد والوں پر اللہ کے حکم سے غالب بھی آجاتی ہیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اگرچہ یہاں یہ نہیں بتایا گیا کہ ایسا کہنے والے کتنے تھے مگر شروع میں یہ کہہ کر سب نے پیٹھ پھرائی اس میں استثناء جو کیا گیا وہ یہ کہ اِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ "مگر بہت تھوڑے سے" اور پھر نہر کے پانی کے پینے میں حکم کی مخالفت سے جو استثناء ہوا وہ یہی کہ اِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ۔ اس سے ظاہر ہے کہ نبی کے زیر ہدایت خداوندی حاکم کے ہمراہ چلنے والی تھی تو اتنی بڑی جماعت جسے جُنُود یعنی افواج کے لفظ سے تعبیر کیا گیا مگر اطاعت اور ثابت قدمی کے معیار پر پورے

لڑنے والے ان میں نہایت کم تھے جنہیں بظاہر اس کثرت سے آدھے یا چوتھائی کی بھی نسبت نہ تھی۔

دوسرا موقع حضرت موسیٰؑ کے بنی اسرائیل کی جماعت کو لیکر فلسطین کی طرف جہاد کے لئے جانے کا ہے۔ پہلے جہاد کی نیت سے چلے اور جب قریب پہنچے تو کیا ہوا؟

قَالُوا یَا مُوسَیٰ إِنَّ فِیهَا قَوْمًا جَبَّارِینَ وَإِنَّا لَنْ نَدْخُلَهَا حَتَّیٰ یَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنْ یَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ

"کہنے لگے اے موسےٰ وہاں تو بڑے سرکش قدآور لوگ ہیں۔ ہم ہرگز وہاں اس وقت تک نہیں داخل ہوں گے جب تک کہ وہ وہاں سے خارج نہ ہو جائیں۔ ہاں جب وہ خارج ہو جائیں گے تو ہم ضرور داخل ہوں گے۔"

اب پہلے موقع پر یعنی قصہ طالوت میں قرآن مجید میں صرف یہ ظاہر کیا تھا کہ ثابت قدم رہنے والے کم تھے۔ مگر اس کمی میں گنجائش کافی ہے یعنی فیصدی پانچ دس بلکہ بیس تیس تک بھی سمجھے جانے کا امکان ہے۔ مگر یہاں قرآن نے شمار کرکے بتا دیا ہے کہ کے نفر تھے جنہوں نے نبی کا ساتھ دیا۔

ارشاد ہوتا ہے :-

قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِینَ یَخَافُونَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَیْهِمَا ادْخُلُوا عَلَیْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ غَالِبُونَ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِنْ

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ۔

صرف دو آدمی ان میں سے جنہیں خوفِ الٰہی تھا ایسے تھے کہ جن کو توفیقِ الٰہی شامل تھی جنہوں نے کہا ان کے مقابلہ میں جاکر شہر پناہ کے دروازہ میں داخل تو ہو۔ جب تم داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تمہارا ہی ہوگا، اور اللہ پہ بھروسا کرو۔ اگر واقعی ایمان رکھتے ہو۔"

مگر انہوں نے کیا کہا؟

قَالُوْا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا انہوں نے کہا ہم ہرگز اس وقت تک داخل نہیں ہوں گے جب تک کہ یہ لوگ اس میں موجود ہیں" اتنا ہی نہیں بلکہ انتہائی جسارت و جرأت کے انداز میں حضرت موسیٰ سے خطاب کرکے کہا:۔

فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ

"بس یہ ہے تو بس تم جاؤ اور تمہارا خدا، دونوں مل کر جنگ کرو۔ ہم ہر حال یہیں بیٹھے رہیں گے۔

نتیجہ میں جناب موسیٰ شکستہ دل ہو کر بارگاہِ الٰہی میں معذرت پیش کرنے لگے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ۔

"عرض کیا پروردگار میرا کسی پر اختیار نہیں ہے، سوائے اپنے اور اپنے بھائی کے۔ اب تو ہی فیصلہ کرنا ہمارے درمیان اور اس فاسق و گنہگار جماعت کے درمیان"۔

یہ دو تفصیلی بیان قرآن مجید میں انبیاء کے جہاد کے متعلق ہیں ان کے علاوہ کوئی تیسری جنگ جس کا مفصل تذکرہ قرآن میں ہو مجھے نہیں معلوم ہوتی اور ان دونوں لڑائیوں میں یہ صاف نظر آگیا کہ اپنے منجانب اللہ حاکم کے ساتھ جنگ کو جانے والے مجموعی تعداد میں کتنے تھے اور ان میں سے ثبات قدم کے معیار پر پورے اترنے والے کتنے آدمی تھے، ظاہر ہے کہ یہی معدودے چند وہ ہو سکتے ہیں جو اُن ربیّون کے مصداق ہوں۔ جن کے اوصاف یہ تھے:

فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا

انہوں نے نہ کمزوری دکھائی نہ اُن میں سستی پیدا ہوئی اور نہ انہوں نے عاجزی سے کام لیا۔ اور جو وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ میں داخل ہونے کے مستحق ہوں نہ یہ کہ وہ پوری جماعت جن میں سے اکثریت نے کمزوری سستی اور بے صبری کا مظاہرہ کیا اور تمام اوصاف مدح سے کلیتہً وہ معرا ثابت ہوئے، یہ تمام کے تمام ہرگز قرآنی الفاظ مدحیہ کے مستحق نہیں ہو سکتے۔

مذکورہ بالا واقعات کے بالمقابل

اصحابِ حسینی کے خصوصی امتیازات

اب میں اصحابِ حسینی کے کردار کو پیش کرتا ہوں جس کا مثل و نظیر صفحاتِ تاریخ پر نہیں ہے۔ کہاں نبی سے خود اس کے ساتھیوں کا جنگ کے لئے کہنا اور نبی کا متنبہ کرنا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جنگ کا حکم ہونے پر تم پہلو تہی کرو اور اُن کا اس وقت زبانی اطمینان دلانا مگر بعد میں دشمن کے سامنے کمزوری دکھانا اور اطاعت سے انحراف کرنا ـــــ

اور کہاں یہ کہ شبِ عاشور خود امام علیہ السلام فرماتے ہیں کہ "تم لوگ بخوشی چلے جاؤ۔ میں نے اپنی بیعت تمہاری گردنوں سے ہٹا لی" خیال یہ ہو سکتا تھا کہ امام کا یہ فرمانا ممکن ہے ان پر بھروسہ نہ ہونے کی وجہ سے ہو مگر آپ نے انہیں وفاداری کی سند تو پہلے ہی دے دی تھی۔ کہہ دیا تھا کہ اِنِّیْ لَا اَعْلَمُ اَصْحَابًا اَوْفیٰ مِنْ اَصْحَابِیْ وَلَا اَھْلِ بَیْتٍ اَبَرَّ وَلَا اَوْصَلَ مِنْ اَھْلِ بَیْتِیْ۔ "میرے علم میں دنیا میں کوئی بھی اصحاب میرے اصحاب سے زیادہ باوفا اور کوئی عزیز میرے عزیزوں سے بہتر نہیں ہوئے" پھر صرف اصحاب سے جانے کو نہیں کہا کہ کہیں احساسِ غیریت پر مبنی نہ سمجھا جائے۔ بلکہ ان سے فرمایا کہ تم میرے اعزا میں سے بھی ایک ایک کا ہاتھ پکڑ لو اور ان کو بھی لیتے جاؤ۔ دشمنوں کو صرف مجھ سے مطلب ہے۔ اگر یہ مجھے پا لیں گے تو کسی دوسرے سے کوئی تعرض نہ کریں گے۔ رات کا پردہ پڑا ہوا ہے اور راستے کھلے ہوئے

ہیں - موقع سے فائدہ اٹھاؤ اور نکل جاؤ -"

حضرت نے یہ ارشاد فرما کر دنیا کو ایک غلطی فہمی سے بچا لیا

وہ یہ کہ نویں تاریخ محرم کے بارے میں یہ فقرہ وارد ہوا ہے کہ

تاسوعا یوم حوصر فیہ الحسین یعنی نویں تاریخ محرم کی

امام حسینؑ چاروں طرف سے گھر گئے تھے - اس کے معنی یہ ہیں

کہ شب عاشور تک ناکہ بندی مکمل ہو گئی تھی اور چاروں طرف

سے گھیرا ڈال لیا گیا تھا - اس صورت میں خیال یہ ہو سکتا ہے

کہ اصحاب حسینؑ چاروں طرف سے گھرے ہوئے تو تھے ہی اب اگر

لڑ بھڑ کر جان نہ دیتے تو کیا کرتے - نکلنے کا کوئی امکان ہی نہیں

تھا - مگر امام کے اس قول نے کہ "راستے کھلے ہوئے ہیں" یہ غلط فہمی

دور کر دی - حقیقت یہ ہے کہ ناکہ بندی اس لئے ہوئی تھی کہ کوئی

نصرت حسینؑ کے لئے نہ آسکے لہٰذا آنے والوں کے لئے راستے بند

تھے، مگر امام کا ساتھ چھوڑ کر جانے والوں کے لئے راستے ہرگز

بند نہ تھے جو چاہتا وہ چلا جاتا - دشمنوں کو اس سے مزاحمت کی

ضرورت کیا تھی -

پھر یہ کہ ہم عموماً فتوے تلاش کرتے ہیں کہ مواخذہ آخرت سے بچتے

ہوئے فرائض سے سبکدوشی جہاں تک ہو جائے اچھا ہے - یہاں اگر

کا فتویٰ کیسا! خود امام وقت کہہ رہا تھا کہ میں نے بیعت تمہاری گردنوں

سے اٹھالی ہے - ظاہر ہے کہ امام حسینؑ کا ساتھ چھوڑنے میں دنیا کی خیر

کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ دنیا میں تو بظاہر یہ خطرہ سے بچاؤ کا ذریعہ تھا بے شک آخرت کا خطرہ ہو سکتا تھا، لیکن امامؑ کا اجازت دے دینا اور بیعت اٹھا لینا اس بات کا ضامن تھا کہ حشر میں ان سے باز پرس نہ ہوگی کہ کیوں گئے۔ ظاہر ہے کہ امامؑ کا یہ فرمانا (معاذ اللہ) ظاہر داری یا تکلّف پر محمول نہیں کیا جا سکتا۔ آپؑ نے امام وقت کی حیثیت سے اپنے منصب کی تمام ذمہ داریوں سمیت یہ اجازت دی تھی اب جان بچانے میں کیا چیز مانع تھی، لیکن بخدا کربلا سے زیادہ دنیا کی زندگی کو کبھی ذلیل نہیں ثابت کیا گیا۔ حسینؑ کی بخشی ہوئی جانوں کو انصار پھر حسینؑ کے قدموں پر ڈالے دے رہے تھے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ انصار کے سینوں میں جو طوفانِ وفا موجزن تھا۔ اس کے اظہار کے لئے واقعیت کی دنیا میں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔ لہٰذا جب واقعیت سے اظہار ممکن نہ ہوا تو مفروضات سے کام لیا گیا۔ کسی نے کہا بخدا میں تلوار سے جنگ کروں گا اور تلوار ٹوٹ جائے گی تو پھر نیزہ سے اور نیزہ بھی بیکار ہو جائے گا تو دشمنوں کو پتھر مارتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ اسی حالت میں مر جاؤں گا۔

یہ ہے وہ قوت جس کا قرآن نے ان لفظوں میں ذکر کیا تھا کہ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا۔ ان میں سستی عمل اور کمزوری پیدا نہیں ہوئی۔ مادی طاقت تو کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ تلوار تھی، وہ ٹوٹ گئی

نیزہ رہ گیا تھا وہ بیکار ہو گیا۔ اسلحہ مفقود ہوتے جاتے ہیں مگر قوت عمل میں کمی نہیں ہوتی۔ خود ان میں کمزوری نہیں پیدا ہوتی۔

کوئی کہتا ہے "بخدا اگر ستر بار قتل کیا جاؤں اور جلایا جاؤں اور خاک کو ہوا میں منتشر کیا جائے اور پھر زندہ کیا جاؤں تو آخری بار بھی تمنا یہی ہو گی کہ آپ کے قدموں میں جان نثار ہو"

اب ذرا اولوالعزم پیغمبر حضرت موسیٰؑ کے بارگاہِ الٰہی میں معذرت کرنے کو یاد کیجئے اور پھر شہید کربلا حضرت امام حسینؑ کی ذاتی قوت عزم کا اندازہ لگائیے وہاں ساتھ والوں کی بے وفائی دیکھ کر حضرت موسیٰؑ بارگاہِ الٰہی میں عرض کرتے ہیں کہ خداوندا میرا کسی پر اختیار نہیں ہے سوائے اپنے اور اپنے بھائی کے ــــ اس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ مددگاروں کے سہارے کو مہم کی تکمیل میں ضروری سمجھتے ہیں۔ خدا بھی اس معذرت کو قبول کر لیتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ واقعہ ہے کہ پھر حضرت موسیٰؑ کی زندگی میں بیت المقدس میں داخلہ نہ ہونا تھا نہ ہوا لیکن امامؑ اپنے اصحاب سے خود کہہ رہے ہیں کہ تم چلے جاؤ یعنی حسینؑ تنہا اس مہم کے لئے اپنے کو کافی سمجھتے ہیں ــــ وہ اس بارے میں اپنے بھائی تک کا استثناء نہیں کرتے سوائے ذات بے نیاز کے ہر دوسرے سے مکمل بے نیازی کا یہ وہ مرقع ہے، جو اپنی آپ ہی نظیر ہے۔

اب یہ دیکھیے کہ طالوت نے اپنے تمام ہمراہیوں کو پانی پینے

سے منع کر دیا۔ اور کہا کہ یہ تمہارا امتحان ہے کہ نہر سامنے موجود ہو اور لب تر نہ ہوں، مگر تمام ساتھیوں نے سوائے بہت تھوڑے لوگوں کے پانی پی لیا۔ اور یہاں امام حسینؑ نے اپنے اصحاب کو کبھی ممکن ہو تو پانی پی لینے سے منع نہیں کیا تھا۔ نہ یہ کہا کہ بغیر میرے پانی نہ پینا مگر نافع بن ہلال، بریر ہمدانی اور بہت سے اصحاب ایسا ہوا کہ نہر تک پہنچ گئے، پھر بھی لب تر نہ کئے اور اس سلسلہ میں جناب ابوالفضل العباسؑ کی شان نمایاں حیثیت رکھتی ہے امامؑ نے ان کو تن تنہا پانی لینے کے لئے بھیجا تھا۔

حضرت عباسؑ کے بے نظیر خصوصی شجاعت

یہ عباسؑ کی خاص خصوصیت تھی کہ آپ نے اتنے موانع کے سدّراہ ہونے کے ساتھ جہاد کیا۔ ایک طرف علم سنبھالنے کی ذمہ داری پھر سقائی کے مقصد کا لحاظ، پھر دشمنوں کو راستے سے جنگ کر کے ہٹانا مگر عباس اپنی کوشش میں کامیاب ہوئے ـــ دریا پر پہنچے، گھوڑے کو پانی میں ڈالا، مشک بھری اور روایت بتاتی ہے کہ چلو میں پانی لیا ـــ بالکل اس استثناء کے مطابق جیسے آیت قرآنی نے گزشتہ واقعہ طالوت میں ذکر کرنا ضروری سمجھا تھا۔ چلو میں پانی لے کر پھر پھینک دیا اور پیاسے نہر نکل آئے ـــ اتنی دیر تک اطمینان سے جناب عباسؑ کا دریا کو نہ یہ قدم رکھنا

alhassanain.org

کر مشک میں پانی بھرا، چلو میں پانی لیا، اس کی طرف نظر کی اور حسینؑ و اطفالِ حسینؑ کی پیاس کو یاد کر کے پھینکا اور پھر مشک سے پانی بھر کر واپسی کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ جناب عباسؑ نے فوجِ دشمن کو بہت دور تک بھگا دیا تھا اب اتنی دیر میں فوج واپس آئی اور یہ دیکھ کر کہ عباسؑ پانی لئے جا رہے ہیں، پوری طاقت سے سدِ راہ ہوئی۔ فنِ حرب سے واقف افراد جانتے ہیں کہ نشیب کی پستی سے دشمن کا مقابلہ جب وہ بلندی پر ہو بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ دریا کے گھاٹ کا راستہ ڈھالو ہوا کرتا ہے حضرت عباسؑ دریا سے پانی لے کر نکلے اور اوپر کی طرف روانہ ہوئے اور فوجیں ساحل کے اوپر سے سدِ راہ۔ نیزہ باز نیزے تانے ہوئے گھیرا ڈالے ہیں کہ شیر بڑھنے نہ پائے اس صورت میں عباسؑ کا دریا سے نکلنا کیونکر ممکن تھا۔ صورتِ حال پر غور کرکے میں تو یہ الفاظ بالکل صحیح سمجھتا ہوں کہ عباسؑ اپنے سینے سے نیزوں کو ریلتے ہوئے باہر آ گئے۔

یہ وہ شجاعت ہے جس کا تصور بھی انسان کے لئے مشکل ہے اور یہ شاید اسی کا نتیجہ تھا کہ عباسؑ بعد شہادت زخموں سے اتنے چوُر تھے کہ لاش کا اٹھنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے جہاں گھوڑے سے گرے تھے وہیں پر قبرِ مطہر بھی بنی۔ لاش کا خیام حرم اور لاشہائے شہدا تک لے جانا ممکن نہ ہوا۔

پیغمبر اسلامؐ کے مجاہدات اور ہمراہیوں کی کیفیات

اب یہ دیکھنا ہے کہ خود ہمارے پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰؐ کو جو جہاد کرنا پڑے ان میں ہمراہیوں کے عزم و ثبات کی کیا کیفیت تھی۔ اس میں اگر ہم تاریخ کے صفحات کی طرف نظر ڈالیں تو بہت سے دلوں کے آبگینوں کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے تاریخ کے دفتر بے پایاں کی طرف رجوع کرنے کے بجائے صرف قرآن مجید میں جو تذکرے ان مواقع کے ہیں ان کو صرف ان آیات کے ساتھ پیش کر دیا جائیگا جن سے اجمالی حیثیت سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ پیغمبرؐ کے ساتھ کی پوری جماعت اس معیار پر جس کا قرآن مجید میں تذکرہ ہوا تھا کہاں تک پوری اترتی ہے۔

اس کے لئے پہلے وہ آیت ملاحظہ ہو جس میں قرآن مجید نے بتایا ہے کہ مسلمانوں کو جب جہاد کا حکم ہوا تو ان میں سے کچھ افراد کا کیا عالم ہو گیا

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى وَلَا تُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا۔ کیا تم نے نہیں دیکھا ان لوگوں کو جن سے کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روکے رکھو یعنی ابھی جہاد کا موقع نہیں ہے بس نمازیں پڑھتے

رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو یعنی اپنے فرائض کو انفرادی طور پر انجام دیتے رہو، مگر انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہمیں اذنِ جہاد دیا جائے، تو جب ان پر جنگ کا فریضہ عائد کیا گیا تو صورت یہ نمایاں ہوئی کہ ان میں کی ایک جماعت انسانوں سے اتنا ڈرتی ہے جتنا خدا سے ڈرنا چاہئے بیا اس سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ پروردگار! یہ تو نے ہم پر جہاد کیوں لازم قرار دے دیا۔ ابھی ہم کو تھوڑی سی اور مہلت کیوں نہ دی (اس کے جواب میں ان سے) کہنا چاہئے کہ دنیا کا ساز و سامان (جس کی حفاظت کے لئے تم میدان جہاد سے بھاگتے ہو) بہت ہی کم اور بے حقیقت ہے اور آخرت بہتر ہے ان لوگوں کے لئے جو تقوےٰ اختیار کریں اور تمہارے ساتھ ذرہ بھر بھی بے انصافی نہ ہو گی"

ظاہر ہے کہ جن جن انبیاء کی قیادت و رہنمائی میں اللہ والوں نے کفار و مشرکین کے مقابلہ میں جنگ کی ہو اُن میں ہمارے رسولؐ سے بڑھ کر کوئی بہتر و افضل سردار عالم وجود میں نہیں آیا۔ آپ بحیثیت رہنمائی سب میں افضل تھے۔ مگر ساتھ والوں کی جماعت آپ کے یہاں بھی خالص نظر نہیں آتی۔ اگرچہ یہاں تعداد نہیں بتائی گئی۔ نہ مقدار کہ وہ کم ہیں یا زیادہ۔ مگر ایک جماعت ایسی ضرور ہے جو اللہ پر اعتراض کرتی ہے کہ اتنا بڑا سخت فریضہ ہم پر کیوں عائد کر دیا گیا۔ بلکہ خوف و دہشت کا ان کے یہ عالم ہے کہ وہ بندوں سے خدا سے زیادہ ڈر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب دل پر خوف

کے طاری ہونے کا یہ عالم ہے تو ناممکن ہے کہ عمل میں ضعف و سستی نہ پیدا ہو، لہٰذا جماعت اس معیارِ شجاعت پر قطعاً پوری نہیں اترتی جس کا وصف قرآنِ مجید نے یہ بیان کیا تھا کہ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا "نہ ان میں سستی پیدا ہوئی نہ کمزوری اور نہ اظہارِ عاجزی"

اب اس کے بعد اُن خاص خاص جہاد کے مواقع پر نظر ڈالئے جن کی تصویر کشی قرآنِ مجید میں کی گئی ہے - ان میں یہ اجمال زیادہ افسوسناک تفصیل کی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔

بدر: اسلام کا سب سے پہلا جہاد بدر تھا - اس کے بارے میں پہلے یہ آیت اُتری تھی - يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ عَلَى الْقِتَالِ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ وَإِنْ يَكُنْ مِائَةٌ يَغْلِبُوا أَلْفًا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ۔

"اے رسول مسلمانوں کو جنگ کی ترغیب دو اور ان سے کہدو کہ دشمن کی کثرت تمہارے لئے عذر نہیں بن سکتی - اگر تم میں بیس صبر کرنے والے ہیں تو انہیں دو سو پر غالب آنا چاہئے" یعنی اُدھر کی قوتِ عددی کا اِدھر کی حقانیت والی طاقت سے اتنا تو اتزان ضرور قائم ہونا چاہئے کہ تم میں کے بیس ۲۰ دو سو پر بھاری ہوں - کیوں؟ قرآن نے اس کی وجہ بتادی ہے

رِبِاَنَّھُمۡ قَوۡمٌ لَّا یَفۡقَھُوۡنَ) یہ اس لئے کہ تم میں معرفت اور ضمیر کی پختگی ہے۔ وہ لوگ علم و معرفت کے لحاظ سے کسی مستحکم قدم سے آگے نہیں بڑھ رہے ہیں۔ وہ تو ناسمجھی سے جذبات کی رو میں جا رہے ہیں یا طمع مال اور اکثریت کے دباؤ وغیرہ کے شکنجہ میں کھینچ کر آگے بڑھ رہے ہیں اور تم معرفت، یقین اور فہم و بصیرت کے ساتھ چل رہے ہو لہٰذا اگر ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو اور تمہاری اتنی کم ہو کہ وہ تمہارے دس گنے ہوں، تب بھی تمہیں مغلوب نہ ہونا چاہئے۔ یہ مسلمانوں کی جماعت کے سامنے پہلا معیار تھا جو پیش کیا گیا مگر اس کا نتیجہ کیا ہوتا! ابھی عمل کی منزل سامنے نہیں آئی۔ جنگ درپیش نہیں ہوئی۔ صرف لفظوں میں دشمن کی اس کثرت کا تذکرہ سننے میں آیا تھا کہ سننے والوں میں بے چینی پیدا ہو گئی۔ اور اتنی بے چینی کہ قرآن مجید کی دوسری آیت نے اس کا اظہار کیا اور حکم اوّل کو بربنائے تخفیف برطرف کر دیا گیا اَلۡـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنۡکُمۡ وَ عَلِمَ اَنَّ فِیۡکُمۡ ضَعۡفًا فَاِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغۡلِبُوۡا مِائَتَیۡنِ وَ اِنۡ یَّکُنۡ مِّنۡکُمۡ اَلۡفٌ یَّغۡلِبُوۡۤا اَلۡفَیۡنِ بِاِذۡنِ اللّٰہِ وَ اللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ۔

"اب اللہ تم سے تخفیف کرتا ہے اور یہ ثابت ہو گیا، کہ تم میں کمزوری ہے (اب اتنا تو ضرور ہونا چاہئے کہ) اگر تم میں سو صبر کرنے والے ہوں تو دو سو پہ غالب آئیں اور اگر تم میں ہزار صبر کرنے والے ہوں تو دو ہزار پہ غالب

آئیں اللہ کے حکم سے۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔"
اب قرآن کی اس تصریح کے ساتھ کہ عَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضُعْفًا "تم میں کمزوری ثابت ہوئی، قرآن کے اس معیار کو یاد کیجئے فَمَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا "ان میں نہ سستی پیدا ہوئی اور نہ کمزوری" تو آپ کو ماننا پڑے گا کہ رسولؐ کے ساتھ کی پوری جماعت اس معیار پر پوری نہیں اتری، پھر جبکہ پہلا معیار بتصریحِ قرآن ضمیر کی پختگی کے لحاظ سے قرار دیا گیا تھا، تو اب کمزوری ظاہر ہونے کے معنی صرف صبر اور قوتِ عمل میں ہی کمی نہیں ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ایمان اور معرفتِ حق میں کمی بھی ثابت ہوتی ہے۔ پھر کاش تخفیف کے بعد جو معیار قرار دیا گیا ہے اس میں پوری جماعت پوری اترتی مگر بعد کے واقعات بتاتے ہیں کہ جماعت کے اکثر افراد اس معیار پر بھی کامل نہیں اترے۔

اُحد دوسری منزل ہے جنگِ اُحد کی، یہ اس تخفیفِ معیار کے بعد کی منزل ہے۔ مگر نتیجہ کیا نظر آتا ہے۔ فتح کے بعد شکست کیونکر ہو گئی، اسے کسی انسانی تاریخ کے بجائے قرآن ہی کے اندر دیکھیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

لَقَدْ صَدَقَکُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ
خدا نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا کہ تم نے ان دشمنوں کو پہلے اس کے فضل و عنایت سے شکست دے دی۔ مگر

اس کے بعد کیا ہوا۔ ملاحظہ ہو۔

حَتّٰۤی اِذَا فَشِلۡتُمۡ وَتَنَازَعۡتُمۡ فِی الۡاَمۡرِ وَعَصَیۡتُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِ مَاۤ اَرٰىکُمۡ مَّا تُحِبُّوۡنَ مِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الدُّنۡیَا وَمِنۡکُمۡ مَّنۡ یُّرِیۡدُ الۡاٰخِرَۃَ۔

"یہاں تک کہ جب تم میں سستی پیدا ہوئی، اختلاف باہمی ہوا اور حسب دلخواہ فتح ہونے کے بعد اللہ کی حکم عدولی کی۔ اس وقت تم میں کچھ دنیا کو اپنا نصب العین بنائے ہوئے تھے، اور کچھ آخرت کو"

اب بتائیے کہ خالق کے اس ارشاد کے بعد کہ "فَشِلۡتُمۡ" تم میں سستی پیدا ہوئی" کیا یہ جماعت فَمَا وَهَنُوا۔ وَمَا ضَعُفُوا (نہ اس میں سستی پیدا ہوئی نہ کمزوری) کی مصداق قرار پاسکتی ہے؟

اس وقت منظر کیا تھا؟ اسے قرآن مجید ہی کے لفظوں میں سنئے میں سوائے ترجمہ کے اس کی کوئی تفصیل بیان نہیں کر رہا ہوں:۔

اِذۡ تُصۡعِدُوۡنَ وَلَا تَلۡوٗنَ عَلٰۤی اَحَدٍ وَّالرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ فِیۡۤ اُخۡرٰىکُمۡ "جبکہ تم پہاڑ پر چڑھے چلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول تمہیں پس پشت سے پکار رہے تھے" ـــ یہ ہے ہمراہیوں کی جماعت کا عام کردار جسے قرآن مجید ان الفاظ میں پیش کر رہا ہے نکتہ رس، بلاغت کے معیار کے پہچاننے والے اس سے یہ سمجھ سکتے

ہیں کہ اس حکم سے مستثنیٰ اتنے کم افراد رہ گئے تھے کہ مقام خطاب میں سب کی طرف نسبت دینا صحیح تھا ـــ یعنی اگر آدھی چوتھائی جماعت بھی ثابت قدم ہوتی متکلم کو حق نہیں پیدا ہوتا کہ پوری جماعت کی طرف نسبت دے کر واقعہ کو بیان کرے ـ بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مستثنیٰ صرف کچھ افراد تھے لیکن من حیث الجماعت سب کی یہ حالت تھی جو بیان ہوئی ہے۔ حقیقت امر یہ ہے کہ اس کے بعد تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت ہی نہیں ـ قرآن نے سب کچھ بتا دیا ہے اسے جس میں سمجھنے کی صلاحیت ہو ـ قرآن مجید نے اس جماعت کے بارے میں اپنا فیصلہ بھی سنا دیا ہے۔ کہ اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا "جن لوگوں نے میدان جنگ سے روگردانی کی اس جنگ کے دن انہیں ان کی کچھ بداعمالیوں کی بدولت شیطان نے بہکا دیا تھا"

اس کے بعد کیا شبہ رہا اس میں کہ وہ قدم جو اس موقع پر اُٹھے تھے وہ حق کے خلاف اور باطل کی راہ پر تھے ـــ اس کے بعد وہ لوگ فَمَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ کے مصداق کہاں رہ سکتے ہیں ـ

خندق اس کے بعد کا موقع ہے جنگ احزاب کا جسے جنگ خندق بھی کہتے ہیں۔ یہ اسلام کی

بڑی اہم لڑائی تھی، کیونکہ جتنی اس وقت کی مخالف طاقتیں تھیں سب یکجا ہو کر پیغمبر کے مقابلہ میں آئی تھیں۔ بہت نازک موقع تھا۔ قرآن مجید میں دیکھئے ذرا اس موقع پر جماعت اسی پیغمبرؐ کے ساتھ والی جماعت کے نفسیات کا مطالعہ کیجئے خالق کے سوا کسی کو باطنی نفسیات کی پردہ کشائی کا حق بھی کہاں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:-

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا"

"یاد کرو اس وقت کو جب وہ لوگ تمہارے اوپر سے آپڑے اور تمہارے نیچے کی طرف سے بھی اور جس وقت تمہاری آنکھیں خیرہ ہو گئی تھیں (خوف سے) دل کھنچ کر گلوں میں آ گئے تھے اور تم اللہ کے متعلق بڑی بڑی بدگمانیاں کرنے لگے تھے۔

یہ دلوں کی حالت عالم الغیب نے بتائی ہے، غنیمت ہے کہ اس جنگ میں کوئی اجتماعی مقابلہ نہیں ہوا، بلکہ ایک فرد کے مظاہرۂ شجاعت پر جنگ ختم ہو گئی ورنہ جس جماعت کے دل کی حالت قرآن نے یہ بتائی ہے اس سے اگر مقابلہ ہو جاتا تو عمل کی کیا حالت ہوتی۔

حُنَین

کہا جا سکتا ہے کہ بدر پہلی لڑائی تھی، اُحد اسی کے بعد ہوئی۔ خندق بھی درمیانی جنگ ہے مگر رفتہ رفتہ خام بھی پختہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کہا جائے گا کہ اسلام کی سب سے بڑی آخری لڑائی حنین کا ذکر بھی قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ اور وہ بھی کچھ ایسا ہی عبرت خیز ہے۔ حالانکہ اس جنگ میں مسلمانوں کی تعداد لشکرِ مخالف کی بہ نسبت کم نہیں بلکہ زیادہ تھی۔ لیکن جو نتیجہ ہوا وہ الفاظِ قرآنی میں اس طرح ہے۔ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُم مُّدْبِرِينَ

اور حنین کے دن کو یاد کرو جب تمہاری کثرت نے تمہیں نازاں بنا دیا تھا۔ مگر اس کثرت نے تمہیں کچھ فائدہ نہ دیا۔ اور زمین تم پر اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہو گئی۔ پھر تم پشت پھرا کر میدانِ جنگ سے بھاگ گئے۔" اب اس کے بعد کون سا وہ وقت سمجھا جا سکتا ہے جب رسولؐ کے ساتھیوں نے بحیثیت مجموعی ثبات و استقلال کے معیار پر اپنے کو پورا ثابت کیا ہو۔

بے شک ان لڑائیوں میں شجاعت کی بے نظیر مثالیں ہیں مگر بعض اشخاص و افراد میں منحصر۔ شجاعت کا نمونہ ہے مگر ایک بڑے ہجوم کی بھیڑ

کے اندر چھپا ہوا ہے جو ڈھونڈے سے مل سکتا ہے۔ مگر ایسی مثال کہاں ہے؟ جہاں پوری جماعت ایسی ہو کہ ان میں ڈھونڈھنے سے بھی کسی میں بزدلی کا شائبہ نظر نہ آسکے۔ جس میں ہر فرد بے مثال ہو کوئی شبہ نہیں کہ تھے اُن میں ایسا اشخاص جو کَاَیِّنْ مِّنْ نَّبِیٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّیُّوْنَ کے مضمون کے موافق سچے اللہ والے ہوں اور ان کی شجاعت تھی ایسی کہ جو نَمَا وَهَنُوْا لِمَا اَصَابَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ مَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا کی مصداق ہو۔ ایسے افراد یقیناً رسولؐ کے ساتھ بھی موجود تھے۔ کون فراموش کرسکتا ہے حمزہؓ کی شجاعت کو؟ کون بھلا سکتا ہے جعفرؓ طیار کی ہمت و بہادری کو؟ کون ناواقف ہو سکتا ہے حضرت علیؑ ابن ابی طالب کی جان نثاری سے۔ ان کے علاوہ ابو دجانہ انصاریؓ وغیرہ بڑے وفادار افراد، قابلِ قدر اور لائقِ تعریف موجود ہیں۔ ان میں کوئی فرد اکمل ہے اور کوئی کامل ہرحال جتنا جس نے بھی حقِ وفا ادا کیا قابلِ مدح ہے۔ لیکن پوری جماعت کو جب دیکھا جائے تو نہ آیت کا معیار پورا نظر آتا ہے، نہ شجاعت کی قابلِ قدر تصویر سامنے آتی ہے۔ مگر کربلا کے میدان میں جو جماعت آئی تھی حسینؑ کے ساتھ یعنی جو حضرتؑ کے ساتھ کربلا کے جہاد میں شریک ہوئے ورنہ یوں آنے کو کیا بہت سے راستے میں ساتھ ہو گئے تھے

مگر وہ حسینؑ کی نکتہ بین نگاہ اور پرکھنے والی نظر تھی جس نے بار بار مجمع کو چھانٹا۔ یہ افراد کا انتخاب اسی لئے تھا کہ کربلا کا معرکہ بے داغ رہے۔ حالانکہ بظاہر یہ سیاستِ جنگ کے خلاف چیز ہے۔ عام طور سے ملکوں پر غنیم کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ پھر بھی حتی الامکان اپنے شہروں میں اس کی خبر نہیں دی جاتی۔ تاکہ بددلی نہ پیدا ہو، مگر امام حسینؑ کا طریقۂ کار اس سے الگ تھا۔ راستے میں کسے خبر تھی کہ مسلمؑ کوفہ میں شہید ہو گئے، صرف امام حسینؑ کو یہ اطلاع ملی تھی۔ مگر آپ نے ضروری سمجھا کہ اصحاب کو جمع کریں۔ جب سب اکٹھے ہو گئے تو حضرت نے تحریری اعلان پڑھ کر سنایا جس کا مضمون یہ تھا کہ "ایہا الناس مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ کوفہ کی حالت دگرگوں ہو گئی اور میرا نمائندہ جو گیا تھا، مسلمؑ بن عقیلؑ وہ قتل کر دیا گیا۔ اب تم میں سے جو کوئی واپس جانا چاہتا ہو وہ واپس چلا جائے"۔

اس اعلان کو سن کر دستہ دستہ افراد اٹھے اور منتشر ہو گئے یہاں تک کہ اتنے ہی رہ گئے جتنے مکہ سے ساتھ آئے تھے۔ عام افراد تو ایسے موقع پر دل شکستہ ہوتے ہیں جس کے ساتھ اتنا مجمع ہو اور پھر چھٹ کر اتنی مختصر تعداد میں رہ جائے۔ مگر بجز حسینؑ نے

اس مجمع کے منتشر ہونے کے بعد اطمینان کی سانس لی۔ یعنی کربلا کے میدان میں جو آپؑ عظیم جہاد فرمانے والے تھے اس قلتِ تعداد سے اس کی کامیابی کا امکان قوی ہو گیا واقعات و حقائق ہی ایسے ہیں جن سے ہم یہ نتیجہ نکالنے پر مجبور ہیں کہ کسی نبی کو ایسی جماعت نہیں ملی جیسی حسینؑ کو ملی اور اسی لئے خود آپ نے شبِ عاشور کے خطبہ میں فرمایا اِنِّی لَا اَعْلَمُ اَصْحَابًا اَوْفیٰ مِنْ اَصْحَابِیْ۔ میرے علم میں کسی کے اصحاب میرے اصحاب سے زیادہ باوفا نہیں ہوئے۔ کسی کو مستثنےٰ نہیں فرمایا۔ "میرے سے اصحاب کسی کو نہیں ملے" انبیاءؑ کو نہیں ملے۔ مرسلین کو نہیں ملے، بلکہ خاتم الانبیاءؐ کو بھی نہیں ملے"۔ یقیناً ان الفاظ کو کہتے وقت آپ کے پیشِ نظر آپ کے جدِ بزرگوار (حضرت رسولِ خداؐ) کے اصحاب بھی تھے۔ اپنے والد بزرگوار کے اصحاب بھی تھے، ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے پوری ذمہ داری کے ساتھ حضرت امام حسینؑ اپنے اصحاب کو یہ سند دے رہے ہیں۔ یقین جانیئے کہ جب ان اصحاب سے باوفا کسی کے اصحاب، حسینؑ ابن علیؑ کے علم میں نہ تھے تو حقیقتاً تھے بھی نہیں۔ اب ناممکن ہے کہ وہ معیارِ شجاعت جو من حیث الجماعت اصحابِ حسینی

نے کربلا میں پیش کر دیا اور کہیں بھی نظر آ سکے۔

شجاعانِ دورِ رسالت سے

شہدائے کربلاؑ کے کارناموں کا تقابل

اب خصوصیت کے ساتھ ان شخصیتوں پر نظر ڈالی جائے جو پیغمبرِ اسلامؐ کے ساتھیوں میں معیارِ شجاعت پر پوری اُترنے والی تھیں، تو اُن کے لئے کلیتہً یہ کہنا تو ممکن نہیں کہ وہ اس نقطۂ شجاعت پر نہ تھے جو کربلا میں پیش کیا گیا۔ اس لئے کہ ان میں حضرتِ امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ کی ذاتِ مقدسہ بھی داخل ہے۔ مگر یہ تو میں ضرور کہہ سکتا ہوں کہ مقامِ عمل میں اُنہیں وہ مواقع پیش نہیں آئے جن میں کربلا کی سی شجاعت کا مظاہرہ ہو سکتا۔ یقیناً حضرت علیؑ بن ابی طالبؑ اپنے بلند ترین معیار کے لحاظ سے جناب حمزہؑ اپنے معیار کے اعتبار سے، جناب جعفر طیارؑ اپنے ممتاز محلِ رفعت کے لحاظ سے، ہر ایک اس منزل پر تھا جو اپنی جگہ نہایت بلندی رکھتی ہے۔ لیکن کربلا کی شجاعت جتنے ناخوشگوار ماحول میں ظاہر ہوئی ایسا ناخوشگوار ماحول کسی

مجاہد کو نہیں ملا۔

امیرالمومنینؑ، آپ کے کارنامے ہر دل پہ نقش ہیں، جناب حمزہؑ کی شجاعت کے تذکرے ہمیں ازبر ہیں۔ جناب جعفرؑ کے کارہائے نمایاں، وہ بھی یقیناً ہمیں معلوم ہیں۔ مگر کربلا کی منزل میں کا ہمیں ہر ایک جعفرؑ نظر آتا ہے۔ ہر ایک حمزہؑ نظر آتا ہے، ہر ایک علیؑ کی یاد دلانے والا نظر آتا ہے۔ عونؑ و محمدؑ اگر ہیں تو وہ اپنے جہاد سے فوجوں کو گواہ کر رہے ہیں کہ ہم جعفرؑ کے پوتے ہیں عباسؑ اپنی یادگار شجاعت سے گویا تمنا کر رہے ہیں کہ علیؑ ہوتے تو اُن سے داد لیتا، اور حسینؑ بن علیؑ، بخدا ان کی تو منزل ہی ایسی ہے کہ اس کے ادراک سے نگاہِ تصور عاجز ہو جاتی ہے۔

حمزہؑ جناب حمزہؑ نے میدانِ احد میں یقیناً بڑا کارنامہ کیا مگر ساتھ میں علیؑ کی تلوار بھی تھی جو آنکھوں کے سامنے چمکتی ہوئی نظر آ رہی تھی اور دل کو قوت دے رہی تھی۔ کربلا میں سوائے چند اصحاب کے کسی شہید نے کسی شہید کے ساتھ مل کر جنگ نہیں کی۔ ان میں سے ہر فرد نے اپنے کو جنگ میں اقلیت سے اقلیت نہیں تبدیل کیا تب مقابلہ کیا۔ ورنہ اگر ۷۲ بحیثیت مجموعی آنِ شجاعت تیس ہزار سے مقابلہ کر لیتے تو بہ بنائے

واقعات یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ کربلا کی تاریخ کسی اور طرح لکھی جاتی۔ ہمیں تو ملتا ہے کہ کوفہ میں ایک تن تنہا مسلم بن عقیلؑ تھے۔ مگر تین دفعہ سردار فوج کو کمک مانگنے کی ضرورت پڑی۔ ایک دفعہ فوج نے شکست کھائی۔ پھر ابنِ زیاد کو لکھا کہ کمک بھیجو۔ دوسری مرتبہ پھر شکست ہوئی پھر کمک مانگی۔ یہاں تک کہ ابنِ زیاد کو غصہ آیا اور کہا کہ ایک فرد کے مقابلہ میں اتنی فوج کافی نہیں ہوتی؟ محمد بن اشعث نے کہلا بھیجا کہ کیا ہمیں کوفہ کے بنئے بقالوں میں سے کسی کے مقابلے کے لئے بھیجا ہے یہ تو بنی ہاشم کی ایک کھنچی ہوئی تلوار ہے۔ یہاں اکیلے مسلمؑ تھے اور کوفہ کا ایسا دشمن سے لبریز ماحول اور جنگ کے لئے غیر مناسب جگہ۔ وہاں یہ صورت ظاہر ہوئی تو کربلا کے میدان میں ۱۸ بنی ہاشم اور اتنے جاں نثار مجاہد۔ یہ سب بحیثیت مجموعی اگر جہاد کرتے تو کیا مجال تھی فوج کی کہ وہ سامنے ٹھہری رہ سکتی اور اب فوجیں کہاں تھیں جن سے کمک منگائی جاتی۔ کوفہ میں جتنے قابلِ جنگ انسان تھے وہ تو سب کربلا میں شریک تھے۔

نتیجہ میں سلطنتِ شام کے وسیع ذرائع تو بہر حال پھر ان کی زندگی کا خاتمہ کرنے کی کوشش

کرتے اور شاید کامیاب بھی ہو جاتے۔ مگر حیاتِ دنیوی کے دور میں مزید وسعت پیدا کی جا سکتی تھی لیکن کربلا میں انصارِ حسینؑ کی طرف سے ہنر جنگ کے مظاہرے یا خواہ مخواہ موت سے بچنے کی صورتیں نہیں تلاش کی جا رہی تھیں۔ وہاں تو نصب العین راہِ خدا میں قربانی پیش کرنا تھا۔ لیکن اس شخصی فریضہ کو انجام دے کر جسے "حفاظتِ خود اختیاری" کے طور پر اسلام نے عائد کیا ہے، اس حد تک کہ جان لینے کی ذمہ داری دشمن پر عائد ہو، اپنے اوپر "خودکشی" کا الزام نہ آئے۔

کربلا میں جہاد بس اتنا کیا گیا جتنا کہ اس فرض کی تکمیل کے لئے ضروری تھا۔ لیکن ایسی صورتیں نہیں اختیار کی گئیں جو اصولِ شجاعت سے ہٹ کر جان بچانے یا زیادہ سے زیادہ دیر کرنے کا ذریعہ ہوں۔ اسی لئے ہر مجاہد نے بس انفرادی طور پر جہاد کیا جو شخصی فریضہ ہے اجتماعی قوت نہیں صرف کی گئی، نہ ایک نے دوسرے کا سہارا ڈھونڈا۔ یہاں تک کہ مجاہدوں نے حسینؑ کو بھی امداد کے لئے نہیں پکارا۔ پکارا اس وقت جب گھوڑے سے گر رہے تھے۔ سلام رخصت کرنے کے لئے۔ مگر اسوقت

جب تلواریں پڑتی تھیں تب نہیں پکارا۔ پکارتے تھے امداد کو نہیں بلکہ گواہِ عمل بنانے کو پکارتے تھے۔ زیارت آخری کے لئے آواز دیتے تھے۔ درمیان میں کبھی نہیں پکارا۔ یہ مستقل کردار ہے ہر شہید کا۔ ایسی مثال کہاں مل سکتی ہے؟ یقیناً تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے؟

جعفرؑ طیارؑ

جناب جعفر طیارؑ کے بے شک جنگ موتہ میں ہاتھ قلم ہوئے۔ وہ سب سے پہلے مجاہد تھے، جن کے ہاتھ راہِ خدا میں قطع کئے گئے۔ وہ علمدار بھی تھے۔ مگر عَلم کے ساتھ مشک سدِراہ نہ تھی۔ کربلا میں ابوالفضل عباسؑ کو تین تین ذمہ داریاں پوری کرنا تھیں۔ جہاد کرنا الگ علم سنبھالنا الگ۔ مشکیزہ بچانا الگ۔ اس کے باوجود جس طرح انہوں نے شجاعت دکھائی اس کا تذکرہ اس کے قبل ہو چکا ہے۔ یوں سمجھ لیجئے کہ یہ دشمن کا انتہائی احساسِ ناکامی تھا کہ اس نے سمجھا، جب تک عباسؑ کے ہاتھ موجود رہینگے ہمیں ان کا روکنا ناممکن ہے۔ کمین گاہ سے ہاتھوں پہ وار کرنا ہی جنگ میں اپنی عاجزی اور بے بسی کا انتہائی مظاہرہ تھا۔ یہی جناب ام البنین روتی تھیں اور مرثیہ میں کہتی تھیں کہ" ارے میرے عباس

کو اس وقت مارا جب ہاتھ نہ رہے، بہادری تو یہ تھی کہ ہاتھوں کی موجودگی میں میرے بیٹے کو مارا ہوتا"

جناب امیرؑ بڑی بلند منزل امیر المومنینؑ علی بن ابی طالبؑ کی ہے۔ مگر باادب عرض کروں گا کہ حضرت نے بڑے بڑے معرکے سر کیے۔ اُحد میں ایسے وقت تلوار چلائی جب ایک بھی مددگار نہ تھا۔ مگر کبھی ایسا نہیں ہوا کہ تین دن کے بھوکے پیاسے ہوں۔ عزیزوں کا غم ہو برابر کے بھائی کا صدمہ اور کڑیل جوان کا داغ بھی ہو۔ یہ حسینؑ ہی تھے جنہوں نے ان حالات میں کارِ نمایاں انجام دیا۔ ان کی مثال تو امیر المومنینؑ کی تاریخ زندگی میں بھی نایاب ہے۔

رسولِ خداؐ شجاعت کے باب میں ظلم ہوگا اگر خود رسولِ خداؐ کا ذکر نہ کیا جائے۔ کیونکہ ظاہر بین افراد کی کوتاہیٔ نظر شجاعتِ پیغمبرؐ کے بارے میں بعض اوقات غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ خیال یہ ہوتا ہے کہ جتنے مظاہرے شجاعت کے ہوئے وہ سب امیر المومنینؑ سے، جناب رسالت مآبؐ کا مظاہرۂ شجاعت کیا ہے؟ مگر میں کہتا ہوں کہ شجاعت کا تعلق قوتِ دل کے ساتھ ہے۔ قوتِ عزم کے ساتھ ہے یہ نہ دیکھنا چاہیئے کہ فوجوں پر حملے کئے یا نہیں

یہ نہ دیکھو کہ اپنے ہاتھ سے کسی کو قتل کیا یا نہیں۔
یہ دیکھو کہ میدانِ جنگ میں جب تقریباً سب کے
قدم اُٹھ گئے تو اس وقت رسولؐ اپنی جگہ سے کسی
اور طرف ہٹے تو نہیں؟ جہاد کے میدان میں رسولؐ کا
اطمینانِ قلب وہ ہوتا تھا کہ علیؑ بن ابی طالبؑ ایسے
شجاع کا ارشاد ہے کہ رسولؐ کو دیکھ کر میدانِ جنگ
میں ہمارے ہمت و حوصلہ میں اضافہ ہوتا تھا۔ یہ بھی
آپؑ نے بتایا ہے کہ جب جنگ شدت سے ہوتی
تھی تو رسولؐ ہم سب سے زیادہ دشمن کے قریب ہوتے
تھے۔ معرکۂ اُحد میں جس وقت تمام مجمع منتشر ہو چکا تھا
اس وقت بھی پیغمبرؐ اسی نقطہ پر تھے جس پر پہلے موجود
تھے اور حضرت علیؑ کا یہ اعتماد تھا پیغمبرؐ کی شجاعت
پر کہ جس وقت آپ نے مجمع کے اندر نظر کی اور رسولؐ
دکھلائی نہ دیئے تو جیسا آپ نے بعد میں بیان فرمایا
اس وقت آپ کو یہ خیال ہوا کہ شاید اللہ نے اپنے پیغمبرؐ
کو آسمان پر اٹھا لیا جس طرح عیسیٰؑ کو اٹھا لیا تھا یا آپ شہید
ہو گئے۔ یہ سوچ کر تلوار کے نیام کو توڑ کر پھینک دیا اور طے
کر لیا کہ رسولؐ زندہ نہیں تو میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ جب مجمع
منتشر ہوا تو دیکھا۔ پیغمبرؐ اسی جگہ زمین پر تشریف فرما ہیں اس

طرح کہ سرِ مبارک، چہرہ مطہر اور دہن اقدس سے خون جاری ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ امیرالمومنینؑ نے جب نہیں پایا تو تصور تک نہیں کیا کہ معاذ اللہ پیغمبرؐ نے جگہ چھوڑ دی ہو اور نتیجہ سے اسی کا ظہور ہوا۔ دشمن کے مقابلہ میں پست ہمتی اور کمزوری کا ظاہر نہ ہونا ثابت قدمی اور استقلال کے ساتھ اپنی جگہ برقرار رہنے سے متعلق ہے۔ اب یہ اپنا اپنا فریضہ ہے کہ کوئی اپنی ذمہ داری محسوس کرتا ہے تلوار لے کر لڑنے میں اور کوئی اپنا فریضہ محسوس کرتا ہے۔ خاموشی کے ساتھ حربوں کے برداشت کرنے میں حقیقت امر تو یہ ہے کہ پیغمبرؐ کی شجاعت کا بہترین مرقع حسینؑ نے کربلا میں پیش کیا ہے اور اس کے متعلق ایک حدیث بھی ہے کہ جناب فاطمہ زہرا صلوات اللہ علیہا اپنے دونوں صاحبزادوں کو لے کر رسولؐ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ بابا ان دونوں کو کچھ عطا فرمایئے تو حضرت نے فرمایا:

اَمَّا الْحَسَنُ فَلَهُ حِلْمِیْ وَسُؤْدَدِیْ وَاَمَّا الْحُسَیْنُ فَلَهُ جُرْأَتِیْ وَجُوْدِیْ (یعنی) ان دونوں کو کچھ دینے کی کیا ضرورت ہے۔ ان میں تو میری صفتیں تقسیم ہو گئی ہیں۔ حسنؑ

کے لئے بیرا حلم اور شانِ سرداری ہے اور حسینؑ کے لئے میری شجاعت اور سخاوت ہے۔" اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ رسولؐ کی شجاعت کو سمجھنا ہو تو حسینؑ کا عمل دیکھو دنیا صرف یہ دیکھتی ہے کہ رسولؐ نے تلوار نہیں کھینچی اس لئے شجاعت کے سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے میں کہتا ہوں حسینؑ کو دیکھو کہ جب تک ایک بھی کربلا میں تھا حسینؑ نے تلوار نہیں چلائی۔ حسینؑ نے تلوار کب کھینچی جب کوئی پاس نہ رہا۔ اب یہ تو موقع کی بات ہے کہ رسولؐ کے لئے ایسا وقت نہیں آیا کہ جہاد میں ایک متنفس بھی نصرت کرنے والا باقی نہ رہ جائے۔ اس طرح حسینؑ نے شجاعتِ رسولؐ کی تفسیر کر دی۔ رسولؐ کے پاس علی ابن طالبؑ بہر حال موجود رہے، رسولؐ کو ضرورت تلوار کھینچنے کی نہیں پڑی۔

حسینؑ کی بے نظیر شجاعت

حسینؑ نے بھی جب تک عباسؑ موجود رہے تلوار کو نیام سے نہیں نکالا۔ ہاں جب کوئی نہ رہا، نہ علی اکبرؑ رہے نہ قاسمؑ رہے نہ عباسؑ باقی رہے اُس وقت اُس سخت وقت، اُس دلدوز وقت، اُس جگر خراش اور ہمت شکن

وقت میں تلوار کھینچی۔ اب جب کہ شجاعت کی داد دینے
والا بھی کوئی نہ تھا۔ بخدا حسینؑ ایک طرف تو جنگ کر رہے
تھے اور دوسری طرف عباسؑ یاد آرہے ہوں گے، علی اکبرؑ
یاد آرہے ہوں گے، تمام انصار یاد آرہے ہوں گے
اس عالم میں تن تنہا ہزاروں سے مقابلہ کیا اور اس
اطمینانِ قلب کے ساتھ جس کا اعتراف دشمن کی فوج
کے ایک سپاہی نے ان الفاظ میں کیا جو تاریخ طبری میں
درج ہیں کہ مَا رَأَیْتُ مَکْثُوْرًا قَطُّ قَتَلَ اَوْلَادَہٗ
وَاَصْحَابُہٗ اَرْبَطُ جَاشًا مِنَ الْحُسَیْنِ۔

"میں نے نہیں دیکھا کوئی آدمی جو زخموں سے چور
ہو چکا ہو، اور اس کے اولاد، احباب اور
اعزہ سب قتل ہو چکے ہوں اور پھر بھی وہ حسینؑ
کی طرح مطمئن نظر آئے"

حسینؑ کی شجاعت کا مظاہرہ اس وقت ہوا جب علی اکبرؑ
اپنی جوانی کے جہاد کا منظر پیش کر چکے تھے
جب عباسؑ اپنی بہادری کے جوہر دکھا چکے تھے۔ جب
تمام اصحاب و انصار اپنی شجاعت کے نمونے سامنے لا
چکے تھے اب حسینؑ آئے ہیں۔ ساٹھ برس کے قریب کی عمر میں ۷۲ داغ دل پر
اٹھائے ہوئے۔ پسر مردہ اور کمر شکستہ۔ مگر حسینؑ نے جب تلوار کھینچی تو

اپنا تعارف کرا دیا اور اس تلوار کا تعارف کرا دیا کہ یہ تلوار وہی ہے جو کبھی بدر میں کھنچی تھی اور کبھی اُحد میں چمکی تھی کبھی خندق و خیبر اور حنین وغیرہ اور پھر جمل، صفین اور نہروان میں اس کے جوہر دیکھے گئے اور اب آج اس تنہائی، اس تشنگی و گرسنگی، اور اس شکستہ حالی میں بھی وہی تلوار ہے اور وہی دست و بازو۔"

اُسی شجاعت نے حسینؑ کی مظلومیت میں شدت پیدا کردی۔ یعنی ہر شہید کے لئے کسی ایک حربہ کا نام لیا جا سکتا ہے کہ اس حربہ سے اس کا کام تمام ہوا۔ نیزہ یا تلوار یا تیر مگر حسینؑ کا کام تمام کرنے میں جتنے امکانی حربے ہو سکتے ہیں، وہ سب استعمال کیے گئے۔ یہاں تک کہ پتھر دل تک سے کام لیا۔ اس کے بعد یہ بھی اثرِ شجاعت تھا کہ جب مولا بجائے بلندی فرس کے سطح زمین پر نظر آ رہے تھے۔ اس وقت بھی دشمنوں کی اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ آ کر دیکھیں کہ زندہ ہیں یا نہیں۔ اس لئے یہ تدبیر کی گئی کہ گھوڑے اٹھا دیئے خیموں کی طرف۔ امامؑ کے کانوں میں جو گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز پہنچی تو آنکھیں کھول دیں۔ دونوں کہنیاں ٹیک کر اُٹھے اور پکار کر کہا کہ ارے ابھی میں زندہ ہوں۔ میری زندگی میں تمہیں خیام سے کیا مطلب ہے۔ اب پوری فوج پلٹ آئی اور پھر حسینؑ کا جسم تھا اور متواتر حربے

تھے۔ اس کے بعد جب یہ سب ہو بے اپنا کام کر چکے
تو وہ آخری ظالم نہیں ملتا تھا جو چراغِ امامت کو خاموش
کر سکے۔ کتنے ستم گار تھے جو شکست کھا کر واپس گئے۔
وہ گردشِ چشم تھی جو ہر ایک کی ہمت پست کرتی
تھی۔ اس کے لئے کئی مرتبہ کی ناکامی کے بعد وہ
شقی ملا جو اس کے لئے تیار ہو گیا۔ اب اس کے بعد
زبان میں تصریح کا یارا نہیں۔ مگر اجمالی اشارہ ضروری
ہے کہ وہ آخری شقی بھی آیا تو اس وقت تک اپنے
ظلم کی تکمیل نہ کر سکا، جب تک چہرہ سامنے رہا۔
اگرچہ شدتِ ظلم میں مزید اضافہ ہو گیا۔ مگر حسینؑ کے
رعب و ہیبت اور شجاعت کا حیرت انگیز ثبوت دنیا
کے سامنے آگیا۔

تمت بالخیر

قرآن کی بلاغت، اسلام کے معارف، روحانیت کے مدارج
حضور محمد مصطفےٰؐ اور ان کی پاک و پاکیزہ آلؑ کی تعلیمات کے
فہم اور نشر و اشاعت کے لئے امامیہ مشن پاکستان کا صالح لٹریچر
معیاری حیثیت رکھتا ہے۔ ایسے پاکیزہ منشورات کو فروغ دینے کے لئے امامیہ
مشن پاکستان کے ساتھ عملی تعاون فرمایئے۔

خادمِ دین۔ سید حسن علی شاہ کاظمی سیکرٹری امامیہ مشن اردو بازار لاہور

maablib.org

حسینؑ مظلوم کا استغاثہ

هَلْ مِنْ نَاصِرٍ يَنْصُرُنَا هَلْ مِنْ مُوَاحِدٍ يَخَافُ اللّٰهَ فِيْنَا۔

یہ وہ آوازِ استغاثہ ہے جو شہیدِ کربلا حسینؑ مظلوم نے روزِ عاشور اس وقت بلند کی تھی جب کہ حضرت کے تمام اصحاب و انصار شہید ہو چکے تھے۔ اور آپ تن تنہا ایک ہزار نوصد و پنجاہ زخم کھائے ہوئے خون آشام دشمنوں کے نرغہ میں گھرے ہوئے تھے۔

امامؑ مظلوم کی یہی آوازِ استغاثہ تھی جس نے شہدائے راہِ خدا کی لاشوں کو تڑپا دیا تھا اور ان کے گلوہائے بریدہ سے یہ آوازیں آنے لگی تھیں کہ "مولا ہمیں سر و گردن کی جدائی نے مجبور کر دیا ہے اگر ہمیں حیاتِ ثانی عطا ہو تو ہم پھر آپ کی نصرت کے لئے حاضر ہیں۔"

سید الشہداؑ کی یہی آوازِ استغاثہ تھی جس کو سن کر شاہزادہ علی اصغرؑ نے اپنے کو جھولے سے گرا دیا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ بابا ابھی آپ کا یہ شیر خوار ننھا مجاہد نصرت کے لئے حاضر ہے۔

کیا حسینؑ مظلوم کی یہ آواز کربلا میں گونج کر ختم ہو گئی؟ نہیں! ہرگز نہیں! وہ آواز آج بھی فضائے عالم میں گونج رہی ہے اور

قیامت تک گردش کرتی رہے گی۔ مظلومِ کربلا کی اس آوازِ استغاثہ پر لبیک کہنا ہر اس انسان کا فرض ہے جس میں فرض شناسی کا جذبہ موجود ہے۔

آج حسینؑ کی نصرت ان کے مقدس مشن کی نشر و اشاعت ہے، آئیے اس مظلوم، محسنِ انسانیت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان عظیم قربانیوں کی تفصیل، فوائد و نتائج اور اسباب و علل کو سمجھا کر حقیقی اسلام سے روشناس کرائیں۔

اس مقصد کے حصول کی ایک شکل یہ ہے کہ آپ امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ کے معاون و ارکان بنیں۔ دوسروں کو اس طرف متوجہ کریں اور اس کے شائع کردہ لٹریچر کو ملک میں عام کر دیں۔

خادمِ دین:-

سید حسن علی شاہ کاظمی المشہدی

سیکرٹری امامیہ مشن پاکستان رجسٹرڈ

اردو بازار لاہور

مطبوعہ:- تعلیمی پریس لاہور